فلسطینی اور حقِ مراجعت

افرائیم کرش*

ترجمہ و تلخیص: عبدالحمید اعظمی

[فلسطینیوں کے انسانی حقوق کی پامالی اور انہیں حق مراجعت نہ دینے کی صہیونی اسرائیلی ہٹ دھرمی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ذیل میں کرش کے اس مقالے سے جو معروف یہودی رسالے Commentry میں شائع ہوا ہے، اسرائیلی ذہن کھل کر سامنے آتا ہے۔ کرش نے جس طرح یہودی مؤقف کی وکالت کی ہے وہ بعینہ وہی انداز ہے جو ہندوستان کی حکومت کشمیری مسلمانوں کے حق کو پامال کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ (ادارہ)]

۱۹۹۰ء کے آغاز سے ہی تقریباً ہر طبقہ فکر کے اسرائیلی گزشتہ بیس برس کے تصادم کا خاتمہ کرنے کے لیے ''امن بعوض علاقہ'' کے اصول کو (بادلِ نخواستہ) قبول کر لینے پر آمادگی ظاہر کر رہے تھے۔ ایہود بارک نے کیمپ ڈیوڈ کی سربراہی کانفرنس سے لے کر تابا کے مذاکرات تک، چھ ماہ کے عرصے میں، گزشتہ اسرائیلی حکومتوں کی مقرر کردہ علاقائی حدود کو اس توقع پر روند ڈالا کہ اس طرح ''امن بعوض علاقہ'' کے اصول کی بنیاد پر فلسطینیوں سے صلح کی مضبوط بنیاد فراہم ہو جائے گی۔ مزید براں انہوں نے ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ کے بعد سلامتی کونسل کی تسلیم شدہ قرارداد نمبر ۲۴۲ کی عرب حلقوں کی توجیہات کو بھی تسلیم کر لیا۔ اس طرح بارک حکومت نے بالفعل مغربی کنارے اور غزہ کی پوری پٹی فلسطین کی نوزائیدہ ریاست کے حوالے کر دینے کی پیشکش بھی کی۔ اور اسرائیل کے دارالخلافہ یروشلم کے بارے میں بھی حیران کن رعایتوں کا اعلان کیا۔ لیکن فلسطینیوں نے اس کا جواب تشکر سے نہیں بلکہ تشدد سے دیا۔

* Efraim Karsh, "The Palestinians and the "Right of Return", *Commentry*, Vol III, No.5 May 2001.

تابا میں فلسطینیوں نے ایسے بھی مسائل اٹھائے جو کیمپ ڈیوڈ میں بوجوہ پس منظر میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس امر پر مصر رہے کہ جب تک ۴۹-۱۹۴۸ء کے فلسطینی مہاجرین کو اپنے آبائی علاقوں میں واپسی کا حق نہیں ملتا، جواب اسرائیل کا حصہ ہیں، امن وامان کا کوئی بھی معاہدہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ علاوہ بریں انہیں ان کی زمینوں اور مال ومتاع سے طویل محرومی کا تاوان بھی ملنا چاہیے۔

ایسے موقع پر جب اسرائیل نے ۱۹۶۷ء سے پہلے کی سرحدوں پر واپس آنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی، فلسطینیوں کے اس مطالبے نے اسرائیل کی امن کوششوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ گویا فلسطینیوں اور عرب ممالک کا پرانا عزم عود کر آیا کہ اسرائیل میں یہودیوں کو اقلیت میں تبدیل کر کے اس کی حقیقت کو یکسر ختم کر دیا جائے۔ معروف اہل قلم اور امن کے داعی Amos Oz نے اس مطالبے پر اظہار افسوس کیا۔ اس نے لکھا کہ اس طرح شدت پسند اسلامی حلقوں کا یہ مطالبہ پورا ہو جائے گا کہ اسرائیل میں یہودیوں کی حیثیت ذمی کی ہونا چاہیے۔ دوسری جانب فلسطینیوں کا یہ کہنا تھا کہ ''ہم صیہونیت کے تحفظ کے ضامن نہیں ہیں، ہم اپنے حق کا تحفظ چاہتے ہیں''۔ حنان عشروی نے لکھا کہ فلسطینی مہاجرین کا مسئلہ امن کے لیے مرکزی اہمیت کا حامل ہے اسے حل کرنا ضروری ہے۔ مہاجرین کی مراجعت کا حق اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کر رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حنان عشروی صاحبہ اور خود Ames Oz بھی غلطی پر ہیں، کیونکہ یہاں سوال اجتماعی حق مراجعت کا نہیں ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے تاریخ، آبادی کے عناصر ترکیبی، بین الاقوامی قانون اور سیاسی رجحانات کا عمیق مطالعہ ضروری ہے۔

اس ضمن میں فلسطینیوں کے استدلال کی بنیاد یہ امر ہے کہ انہیں مسلسل ظلم و جبر کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ فلسطینیوں کے خیال میں صیہونیت کی یہ ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ عربوں کو ان کی املاک سے بے دخل کر دیا جائے، یہ ایک تاریخی جرم ہے جس کی تلافی کا انہیں حق حاصل ہے۔ یاسر عرفات کے نائب اور ۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے کے اہم معمار محمود عباس کے الفاظ میں، ''جب ہم مہاجرین کے لیے حق مراجعت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مقصد ان کی اسرائیل میں واپسی سے ہوتا ہے کیونکہ اسرائیل ہی نے انہیں بے دخل کیا تھا''۔ سیاسی شدت پسند سلمان ابوستہ نے اس مسئلہ کو مزید زوردار الفاظ میں بیان کیا ہے:

حالیہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایک غیر ملکی اقلیت مقامی اکثریت پر اسی کے وطن میں حملہ کر کے تقریباً تمام باشندوں کو ملک بدر کر دیتی ہے۔ اس کی مادی اور ثقافتی یادگاروں کو ملیامیت کر دیتی ہے۔ اپنے ناپاک عزائم کی منصوبہ بندی باہر سے کرتی ہے اور بیرون ممالک سے امداد بھی حاصل کرتی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ یہ عمل حکم الٰہی کے مطابق اور تہذیب کی فتح ہے۔ جدید تاریخ میں نسلی تطہیر کی یہ سب سے بڑی مثال ہے۔

سب سے بڑی نسلی تطہیر کا یہ دعویٰ حقائق پر مبنی نظر نہیں آتا۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ چھ لاکھ فلسطینی ملک بدر کیے گئے جبکہ جنگ عظیم دوم کے بعد ڈیڑھ کروڑ جرمن باشندے مشرقی یورپ سے نکالے گئے تھے۔ اسی طرح ۱۹۴۸ء میں ہندستان اور پاکستان میں کروڑوں افراد کو اپنا گھربار اور علاقہ چھوڑنا پڑا۔ بیسویں صدی میں لاکھوں آرمینیوں، یونانیوں، ترکوں، فن لینڈ والوں، بلغاریہ والوں اور کردوں کو نقل مکانی کا سامنا کرنا پڑا۔

عربوں کا یہ دعویٰ کہ انہیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وطن سے نکالا گیا بے بنیاد ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ۴۹-۱۹۴۸ء کی جنگ میں خود فلسطینی جارح تھے۔ انہوں نے اپنے ہمسایہ یہودیوں کی تطہیر کی ناکام کوشش کی۔ اگر فلسطینیوں اور عربوں نے اقوام متحدہ کی ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کی قرارداد منظور کر لی ہوتی تو مہاجرین کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا کیونکہ یہ قرارداد فلسطین میں دو ریاستوں کی تشکیل کے بارے میں تھی۔

چونکہ ۱۹۴۸ء کی جنگ میں یہودیوں نے اسرائیل سے فلسطینیوں کو بے دخل کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا اسی لیے یہودی قیادت نے اقوام متحدہ کی اس قرارداد کو منظور کر لیا اور بعد کے تمام مذاکرات اس مفروضے پر آگے بڑھائے گئے کہ فلسطینی عربوں کو اسرائیل میں یہودیوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ اسرائیلی ریاست کے قیام سے قبل، بن گوریان نے جو پہلے وزیراعظم بنے، اپنی لیبر پارٹی کی قیادت کو جتلا دیا کہ ''ہماری مجوزہ ریاست میں غیر یہودی باشندے بھی ہوں گے، جنہیں بلا استثناء ہر طرح مساوی شہری حقوق حاصل ہوں گے''۔

نوزائیدہ ریاست کے بنیادی منصوبے کی تیاری کے دوران عربوں کے لیے پریس اور ان کے

علاقوں میں صحت کے منصوبے تیار کیے گئے، عرب سرکاری کارکنوں کو حکومت کے ڈھانچے میں شامل کرنے، پولیس اور وزارتِ تعلیم میں عربوں کی شرکت اور عرب یہودی ثقافت اور فکری امتزاج کی بھی باتیں ہوئیں۔ تاہم عربوں نے یہودیوں کے امن اور باہم دوستانہ مراسم کے اعلانات کو درخور اعتنا نہ گردانا۔ سابقہ مفتی فلسطین اور عرب اعلیٰ کمیٹی کے سربراہ الحاج امین الحسینی نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ ''عرب جان دے دیں گے لیکن کسی ممکنہ یہودی ریاست میں بطور اقلیت رہنا اور اقلیتی حقوق حاصل کرنا تسلیم نہیں کریں گے''۔ ۱۹۴۷ء میں عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن عظام نے امن کے متلاشی ایک خفیہ یہودی وفد سے کہا کہ ''ہمارے سامنے ایک ہی آزمائش ہے، طاقت کی آزمائش--- ہم آپ کو یہاں سے نکال باہر کرنے کی (ہر ممکن) کوشش کریں گے۔ ہوسکتا ہے ہم کامیاب نہ ہوں مگر جدوجہد کرتے رہیں گے''۔

ان حالات کے پیشِ نظر اسرائیل کو پیدائش سے قبل ہی ختم کر دینے کی دھمکیاں فلسطینیوں کی اجتماعی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ اسرائیل کے عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی بہت سے عرب باشندے نقل مکانی کر چکے تھے۔ اپریل ۱۹۴۸ء تک اسرائیل کے اعلان آزادی سے ایک ماہ قبل تک ایک لاکھ عرب باشندے اہم شہری علاقوں خصوصاً جافا، حیفہ اور یروشلم چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ایک یہودی خفیہ تنظیم کی رپورٹ کے مطابق اوائل جون تک یہ تعداد تین لاکھ نوے ہزار تک اور ۱۹۴۹ء میں جنگ کے خاتمے تک ساڑھے پانچ سے چھ لاکھ تک پہنچ گئی۔

سوال یہ ہے کہ فلسطینیوں کی اتنی بڑی تعداد نے اپنا گھر بار کیوں چھوڑا؟ ظاہر ہے اس کے اسباب میں جنگ سے متعلق حالات، خوف، غیر یقینی اور اقتصادی محرومی سرفہرست ہیں۔ علاوہ بریں ان عوامل میں خود فلسطینیوں کا اپنی قیادت پر عدم اعتماد بھی شامل ہے جن کے بھڑکانے سے وہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے تھے، اور اس کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ ان کی قیادت نے اجتماعی مفاد پر اپنے ذاتی مفادات کو ترجیح دی۔ اس امر پر بے شمار فلسطینیوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ابراہیم ابوالغاض کو بیلجیم کے اُس جہاز راں کی بات نہیں بھولی جس نے جہاز پر جافا کے اتنے سارے نوجوانوں کو دیکھ کر کہا تھا ''آپ لوگ فرار کیوں ہو رہے ہیں جم کر لڑتے کیوں نہیں''۔ اسی طرح جافا سے تعلق رکھنے والے معروف دانشور ہشام شربی نے

جو ۱۹۴۷ء میں امریکہ چلا گیا تھا، تیس برس بعد لکھا کہ ''ہم نے دورانِ جنگ اپنا وطن کیوں چھوڑ دیا؟ صرف اس لیے کہ وہاں اس جنگ کو جاری رکھنے کے لیے کاشتکار موجود تھے۔ ہم پڑھے لکھے لوگ تو دانشوری کے محاذ پر برسرِ پیکار تھے''۔ حقیقتاً ان کاشتکاروں نے بھی تعلیم یافتہ شہری طبقوں سے زیادہ زمین سے وفاداری کا ثبوت نہ دیا، اور رکنے اور جنگ لڑنے کی بجائے ترکِ وطن میں عافیت جانی۔ تاہم ترکِ وطن کی بیشتر ذمہ داری تعلیم یافتہ طبقے ہی پر عائد ہوتی ہے۔

۱۹۴۸ء میں یہودی اور عرب دونوں ہی طبقے اپنے اعیان و اشراف کے طفیل، مصائب، نقل مکانی اور بھرپور جنگ کے گرداب میں پھنس کر رہ گئے۔ تاہم یہودی ایک منظم اور مربوط قومی تحریک کے سبب ان مصائب پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے لیکن فلسطینی یکجہتی کے ناپید ہونے کی وجہ سے منتشر ہوتے چلے گئے اور نقل مکانی ان کا مقدر بن گئی۔

عرب اعلیٰ کمیٹی کے سیکرٹری جنرل حسین خالدی نے ۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو مفتی فلسطین کو واضح الفاظ میں لکھا کہ ''۱۹۳۶ء میں ساٹھ ہزار برطانوی فوج کی موجودگی میں ہمیں کوئی خوف نہیں آتا تھا مگر اب تیس ہزار یہودیوں سے سابقہ پڑا ہے تو ہم ڈر سے کانپ رہے ہیں''۔ بعد میں انہوں نے یہ شکوہ کیا کہ ''ہر شخص جا رہا ہے۔ جن کے پاس بھی بینک میں رقم ہے، دولت ہے، وہ مصر، لبنان، یا دمشق میں آباد ہو چکے ہیں۔ عرب اعلیٰ کمیٹی کے ممبران بھی جا رہے ہیں، میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ کب تک یہ صورت حال برداشت کرتا رہوں گا''۔

اشراف اور اہل الرائے حضرات کی مہاجرت نے درمیانی طبقے اور کاشتکاروں کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ لیکن فلسطینیوں کی اکثریت اپنے قائدین یا فوجی دباؤ اور جنگی حکمت عملی کے تحت ترکِ وطن پر مجبور ہو گئی۔ ان کے اسرائیلی علاقوں سے زبردستی انخلا کی مثال حیفہ سے ان کی بڑی تعداد میں ہجرت ہے جو فلسطین کی اعلیٰ کمیٹی کی ہدایت پر عمل میں آئی، حالانکہ یہودی انہیں روکنے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے۔ یہی حال طبریہ کے شہر میں بھی ہوا۔ جافا میں تو ان کے انخلا کے لیے مقامی میونسپل کمیٹی نے ہزاروں افراد کے لیے سفری سہولتیں فراہم کیں۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہودی فوج نے بھی موقع بہ موقع فلسطینیوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا

تاہم یہ عمل کسی سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ نہیں تھا بلکہ جنگ کی گرما گرمی کا نتیجہ تھا۔

امر واقعہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد کے ترک وطن کرنے کا اندازہ نہ عرب ریاستوں کو تھا اور نہ خود عرب اعلیٰ کمیٹی کو تھا۔ اسی لیے جب اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تو انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں عرب اعلیٰ کمیٹی نے ایک گشتی مراسلہ جاری کیا جس میں فلسطین سے نقل مکانی کی مذمت اس بنیاد پر کی گئی تھی کہ یہ تحریک جہاد اور خود فلسطینیوں کی غیرت پر ایک دھبہ ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہدایت دی گئی تھی کہ نہایت خطرناک علاقوں سے خواتین، بچوں اور بوڑھوں کو محفوظ علاقوں میں منتقل کر دیا جائے لیکن ماہ اپریل کے اواخر میں اردن نے ان مہاجرین کے لیے اپنی سرحدیں کھول دیں اور اعلیٰ کمیٹی کے اس فیصلے کی دھجیاں اڑ گئیں۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کے دوران ایک معروف فلسطینی قائد محمد نمر الخطیب نے قوم کے منتشر ہونے کے اس عمل کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ ''فلسطین کی ہمسایہ عرب ریاستوں نے اپنی سرحدیں اور دروازے مہاجرین کے لیے کھول دیے اور یہودیوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یا تو فتح کے شادیانے بجائیں یا جان کی قربانی دیں''۔ حقیقت حال یہ ہے کہ جیسے ہی مہاجرین ہمسایہ کی عرب ریاستوں میں وارد ہوئے مقامی آبادی اور مہاجرین کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ فلسطینیوں کو یہ شکوہ تھا کہ ان ریاستوں نے فوجی امداد کے اپنے لبے چوڑے وعدے ایفا نہیں کیے۔ جبکہ میزبان یہ کہتے تھے کہ فلسطینی بزدل بھگوڑے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی جنگ دوسرے لڑیں۔ تقریباً ایسی ہی صورت حال خود فلسطین میں موجود تھی جہاں ۱۹۴۸ء میں فلسطین میں داخل ہونے والے عرب رضا کاروں اور مقامی آبادی میں پرتشدد جھڑپیں ہوتی رہیں۔ مقامی آبادی نے اکثر ان رضا کاروں کو عام ضروریاتِ زندگی کی ذرا بھی سے بھی انکار کر دیا تھا۔

باہمی الزام تراشیوں کا سلسلہ طول پکڑتا گیا۔ اگست ۱۹۴۸ء میں ایک فلسطینی قائد ایمل غوری نے لندن کے ایک اخبار ''ٹیلی گراف'' کو انٹرویو دیتے ہوئے مہاجرین کے سنگین مسئلے کا ذمہ دار اسرائیل کو نہیں بلکہ عرب ریاستوں کو قرار دیا۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار مغربی کنارے کے علاقے میں اس وقت کیا گیا جب اسرائیل کی پہلی سالگرہ کے سلسلے میں احتجاج کیا گیا تھا۔ قاہرہ میں قائم برطانوی دفتر برائے

مشرق وسطی کے سربراہ سر جان ٹراوٹ بیک تھے جو یہودیوں اور اسرائیل کے قطعاً دوست نہیں تھے وہ جب یہاں کے حالات کی چھان بین کے لیے جون ۱۹۴۹ء میں غزہ پہنچے تو انہیں یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ مہاجرین نے یہودیوں اور امریکیوں کے خلاف کسی قسم کی تلخی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن انہوں نے مصر اور دیگر عرب ریاستوں کے بارے میں کڑوی کسیلی باتیں کیں۔ اور یہاں تک کہا کہ اگر اسرائیل آ کر ان کے علاقے پر قبضہ کرے تو وہ اس کو خوش آمدید کہیں گے۔

خود فلسطینیوں کا یہ تاثر ہے کہ وہ عرب ریاستوں کی سیاست کا شکار ہوئے ہیں، اسرائیل کا نہیں۔ انہیں یہ بھی یقین ہے کہ اگر اسرائیل جنگ ہار جاتا پھر بھی اس کا فائدہ مقامی عرب باشندوں کو نہیں ملتا بلکہ ہمسایہ عرب ریاستیں علاقہ آپس میں تقسیم کر لیتیں۔ کیونکہ وہ فلسطینیوں کو علیحدہ قوم تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جن علاقوں پر مصر اور اردن کو تسلط ۱۹۴۸ء کی جنگ میں حاصل ہوا وہاں مقامی عرب باشندوں کو حق خود ارادیت سے محروم رکھا گیا۔ مشہور امریکی مورخ فلپ حتی کا کہنا ہے کہ ''تاریخ میں فلسطین کا نام کہیں نظر نہیں آتا''۔ سو تو یہ ہے جدید تاریخ کی ''سب سے بڑی نسلی تطہیر'' کی حقیقت۔

تاریخ کا یہ حوالہ فلسطینیوں کے ترکش کا محض ایک تیر ہے۔ دوسرا تیر بین الاقوامی قانون کی دہائی دینا ہے۔ بقول حنان عشروی ''اقوام متحدہ ان کے اس حق کا ہر سال اعادہ کرتی رہتی ہے''۔

اقوام متحدہ کی جنرل کونسل نے قرارداد نمبر ۱۹۴ دسمبر ۱۹۴۸ء میں منظور کی تھی جب عرب اسرائیل جنگ اپنے شباب پر تھی۔ جنرل کونسل کی قراردادوں کی حیثیت [بخلاف سلامتی کونسل کی قراردادوں کے] اظہار جذبات کی ہوتی ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ قرارداد مہاجرین کے مسئلہ کے حل کے لیے پیش نہیں کی گئی تھی بلکہ اس کا مقصد ایک ایسے مصالحتی کمیشن کی تشکیل تھا جو اسرائیل اور ہمسایہ عرب ریاستوں کے مابین جامع امن کے قیام کے لیے مناسب سہولتیں فراہم کرے۔ اس قرارداد کے پندرہویں پیراگراف میں مہاجرین کا (عرب مہاجرین کا نہیں) اس انداز سے عمومی تذکرہ کیا گیا ہے کہ اس میں ان یہودیوں کی کثیر تعداد بھی شامل ہو سکتی ہے جنہیں ہمسایہ عرب ریاستوں سے زبردستی اور

انتقاماً نکالا گیا ہے۔

قرارداد کی یہ تاویل وہم وقیاس پر مبنی نہیں ہے۔قرارداد میں اس امر کو بہ وضاحت بیان کیا گیا ہے کہ جو مہاجرین اپنے وطن واپس جانا نہ چاہیں بے دخل کرنے والی حکومتیں یا مقتدر ادارے ان کے نقصانات کی تلافی کریں گی۔ اگر اس کا اطلاق صرف عرب باشندوں پر ہوتا تو اس میں تلافی کا ذمہ دار صرف اسرائیل ہی کو گردانا جاتا۔

قرارداد نمبر ۱۹۴ کی اہم ترین شق یہ ہے کہ اس میں جہاں مہاجرین کی واپسی کا ذکر کیا گیا ہے وہیں انہیں کسی دوسرے مقام پر آباد کرنے کا بھی مشورہ دیا گیا ہے۔قرارداد کے الفاظ میں جو مہاجرین اپنے وطن واپس جا کر اپنے ہمسایوں سے امن وامان کے ساتھ رہنے کے خواہش مند ہیں انہیں اس امر کی ہر ممکن عجلت سے اجازت ہونا چاہیے۔لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''ان مہاجرین کو معاشی اور معاشرتی بحالی اور آباد کاری کی سہولتیں بھی فراہم کی جانی چاہییں''۔

قرارداد نمبر ۱۹۴ کی یہی وہ شقیں تھیں جو عربوں کے نزدیک قابل نفرین قرار پائیں اور انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور اتفاق رائے سے اسے مسترد کر دیا۔ کیونکہ اس میں مہاجرین کے مسئلے کے حل کو عرب-اسرائیل کے باہمی امن وامان سے متعلق کر دیا گیا۔ان کی مراجعت اور بحالی کو امکانی صلح وصفائی کے مساوی بتایا گیا اور عربوں کے لیے ترجیحی سلوک کے مطالبے کو گول مول الفاظ کی دھند میں لپیٹ دیا گیا۔جو کسی صورت میں بھی عربوں کے مفاد میں نہیں ہے۔

۱۹۶۰ء سے عربوں نے روس اور تیسری دنیا کے حامیوں کی مدد سے قرارداد نمبر ۱۹۴ کو مہاجرین کی مراجعت کے حق کی قانونی دستاویز قرار دینا شروع کر دیا۔ وہ اپنے دلائل کو مضبوط بنانے کے لیے دیگر بین الاقوامی معاہدات کا حوالہ بھی دیتے ہیں جنہیں بآسانی رد کیا جا سکتا ہے۔آج جبکہ گزشتہ متعدد عشروں سے فلسطینی اپنے ہمسایوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس کے لیے اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۱۹۴ کا سہارا لیتے ہیں، ان کے بارے میں کم از کم یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ دورخے پن کا اظہار کر رہے ہیں۔

جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے انہیں نہایت ہی غلیظ اور بدحال کیمپوں میں رکھا گیا تا کہ اسرائیل کو اس بدحالی کا ذمہ دار قرار دے کر دنیا کی نظروں میں بدنام کیا جا سکے۔ اور ایک متحدہ عرب نقطہ نظر کو تقویت حاصل ہو۔ البتہ معدودے چند فلسطینیوں کو اردن کی شہریت دی گئی ہے۔

۴۹ - ۱۹۴۸ء کی جنگ کے خاتمے کے بعد اسرائیلی تخمینہ کے مطابق فلسطینی مہاجرین کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ سے چھ لاکھ تک تھی۔ جبکہ برطانوی دفتر خارجہ نے اس تعداد سے زیادہ کا اندازہ لگایا۔ ایک برس بعد اس علاقے میں بین الاقوامی امداد کا سیلاب آ گیا اور نو لاکھ چودہ ہزار نام نہاد مہاجرین اقوام متحدہ کے بحالی اور امدادی ایجنسی UNRWA کے پاس رجسٹر ہوئے۔

نصف صدی بعد جون ۲۰۰۰ء میں اسی ادارے کے اعداد و شمار کی رُو سے مہاجرین کی تعداد تیس لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس ادارے کا کہنا ہے کہ یہ تعداد خود مہاجرین نے فراہم کی ہے اور زیادہ سے زیادہ امداد کے حصول کے لیے مبالغہ سے کام لیا ہے (اس میں پندرہ لاکھ کے قریب اردنی باشندوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے)۔ پی ایل او یہ تعداد مزید بڑھا کر پچاس لاکھ بتاتی ہے کیوں کہ ان کے مطابق بہت سے مہاجرین نے اپنا نام UNRWA میں درج نہیں کرایا۔

فلسطینی نمائندے نہ صرف مہاجرین کے حق مراجعت کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ ان کے خیال میں انصاف کے تقاضے اسی صورت میں پورے ہوں گے جب انہیں ۵۰۰ ارب ڈالر بطور زرِ تلافی ادا کیے جائیں۔ ان میں سے نصف رقم مالی نقصانات کی مد میں اور باقی نصف سرمایہ کے نقصان، ذہنی اذیت اور غیر مادی نقصانات کی تلافی کے لیے ہیں۔ علاوہ بریں لبنان، شام، اور اردن جیسے ملکوں نے بھی مہاجرین کی دیکھ بھالی کے اخراجات کی مد میں تقریباً ایک کھرب امریکی ڈالر کا مطالبہ کیا ہے۔

دوسری جانب اسرائیل نے پی ایل او کے اعداد و شمار کا تو ذکر ہی کیا UNRWA کی تعداد کو بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس نے غیر سرکاری طور پر فلسطینی مہاجرین کی تعداد کا اندازہ بیس لاکھ لگایا ہے۔ اگر اسرائیل کی تخفیف شدہ تعداد کو درست مان بھی لیا جائے تو یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ جن کی اسرائیل میں آباد کاری کا مطلب وہاں کی آبادی کے تناسب میں نمایاں تبدیلی لانے کے مترادف ہے۔ فی الحال اسرائیل کی آبادی ساٹھ لاکھ سے کچھ زیادہ ہے جس کا ۷۹ فیصد یہودی ہیں، فلسطینی مہاجرین کی آبادکاری کے بعد

یہ تناسب ۶۰ فیصد رہ جائے گا۔ فلسطینیوں میں آبادی کے اضافے کی شرح کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلسطینیوں کے حق مراجعت کو تسلیم کر لینے سے اسرائیل کی تباہی یقینی ہو جائے گی۔

یہ چونکا دینے والی حقیقت نئی نہیں ہے۔ ایک مصری سیاست دان اور بعد ازاں وزیر خارجہ محمد صلاح الدین نے اکتوبر ۱۹۴۹ء میں مصر کے ایک موقر اخبار ''المصر'' میں اپنے مقالے میں لکھا تھا کہ ''مہاجرین کی فلسطین میں بحالی کا مطالبہ پیش کرنے کا عربوں کے نزدیک یہ مقصد ہے کہ مہاجرین اپنے وطن میں غلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ مالک بن کر واپس آئیں''۔ صاف بات یہ ہے کہ وہ اسرائیل کی ریاست کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔

بعد میں بھی جمال عبدالناصر سے حافظ الاسد اور یاسر عرفات تک بیشتر عرب سیاست دانوں نے مہاجرین کی مراجعت کے حق کا یہی مطلب لیا ہے۔ صرف ۱۹۹۰ء میں پی ایل او نے اوسلو کے معاہدے کے تحت اسرائیل سے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کے حصول کے لیے اس مسئلے کو عارضی طور پر پس پشت ڈال دیا ہے۔ لیکن اسرائیل کی طرف سے مذاکرات کرنے والوں نے مہاجرین کے ''حق مراجعت'' کو پی ایل او کی سودا بازی کا ایک نکتہ تصور کیا ہے تاکہ مذاکرات کی کامیابی کی صورت میں وہ اس مطالبے سے دستبرداری کو اپنی نیک نیتی اور فراخ دلی کے ثبوت کے طور پر پیش کریں۔

۱۹۹۰ء کے دوران اسرائیل اور عربوں کے دانشوروں کی متعدد جماعتوں نے تسلسل سے اس مسئلے پر کسی مفاہمتی حل کے حصول کی کوشش کی۔ لیکن وہ ناکامی سے دوچار ہوتے رہے کیونکہ ''حق مراجعت'' فلسطینیوں کے لیے سودا بازی کا کوئی مسئلہ نہیں بلکہ تمام مسائل کی جڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برس ہا برس سے مہاجرین کی بدحالی کے خاتمے کے اسرائیل کے لائق تحسین اقدامات کو پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ ۱۹۴۹ء میں اسرائیل ایک لاکھ فلسطینی مہاجرین کو واپس لینے پر آمادہ ہوا تھا لیکن عرب ریاستیں راضی نہ ہوئیں تاہم اس تمام عرصے میں خاندانوں کی یکجائی کی اسرائیلی پالیسی کے تحت تقریباً پچاس ہزار فلسطینی واپس آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی سے پچھتر ہزار ترک وطن کرنے والے فلسطینی ان علاقوں میں واپس آ چکے ہیں۔

CAMERA کے الیگزینڈر صفیان نے ان نوے ہزار فلسطینیوں کا ذکر کیا ہے جو اوسلو کے

معاہدے کے بعد سے ان علاقوں میں واپس آ چکے ہیں جو فلسطینی انتظامیہ کے تحت ہیں۔ اس نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ لاکھوں مہاجرین کی بحالی کے لیے اسرائیل نے مالی نقصانات کے دعوے قبول کر کے مالی معاونت بھی کی ہے۔ باوجود یکہ ان پانچ لاکھ یہودیوں کو جو عرب ریاستوں سے ترک وطن کر کے اسرائیل میں پناہ گزین ہوئے عرب ملکوں کی طرف سے ایک پائی بھی بطور معاوضہ ادا نہیں کی گئی۔

فی الحقیقت اگر کسی کو بین الاقوامی قوانین پر عمل درآمد پر اصرار ہو تو اس کے لیے ایک ہی واقعہ بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ ۴۹ - ۱۹۴۸ء میں فلسطینیوں اور عرب ریاستوں نے اسرائیل کی نوزائیدہ ریاست اور یہودیوں کے خلاف جارحانہ جنگ کا آغاز کیا اور اس دوران اپنے یہاں سے ہزاروں یہودیوں کو ملک بدر ہونے پر مجبور کر کے ان کے مال ومتاع پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے یہ جارح قوتیں اپنی شکست کا ذمہ دار یہودیوں کو قرار دے رہی ہیں۔ ذرا تصور کیجیے یہ ایسے ہے جیسے جرمنی کے نازی برطانیہ اور امریکہ سے اپنی شکست کا تاوان طلب کریں اور عراق ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے دوران ہونے والے نقصانات کے ازالہ کا طلب گار ہو۔ یہ تصور قانونی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے مضحکہ خیز ہے۔

درحقیقت ان میں سے کوئی مسئلہ اہمیت نہیں رکھتا۔ [فلسطینیوں کا] حق مراجعت بھی نہ تو عملی طور پر، نہ آبادی کی ہیئت کے اعتبار سے، نہ ہی قانونی طور پر اور نہ ہی تاریخی حوالے سے کسی اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ خود مہاجرین کا مسئلہ بھی کوئی اتنا اہم نہیں ہے جنہیں یوں بے گھر، بے آسرا اور بے سروسامان چھوڑ دیا گیا ہے۔ انہیں نفرت اور جھوٹے خوابوں پر زندہ رکھا جا رہا ہے۔ حالانکہ دنیا میں ان جیسے بلکہ ان سے بھی بُرے حالات میں گرفتار کروڑوں انسانوں کی اس طرح بحالی ہو چکی ہے کہ وہ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اصل مسئلہ اسرائیل کا وجود ہے۔ اور اگر محمد صلاح الدین [ایوبی] کی دیانت دارانہ اصطلاح میں بات کی جائے تو اکثر عربوں اور فلسطینیوں کے دلوں میں ابھی تک یہ خواہش کروٹیں لے رہی ہے کہ اگر ایک طریقے سے نہیں تو دوسرے طریقے سے مگر کسی نہ کسی طرح اسرائیل کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

یاسر عرفات کی کابینہ میں یروشلم کے امور کے وزیر فیصل الحسینی ایک ''اعتدال پسند'' راہنما ہیں۔ انہوں نے یہ لکھا کہ ''تزویراتی طور پر ہم ہار سکتے ہیں یا جیت سکتے ہیں لیکن ہماری نظریں ہمیشہ اس فلسطین

کے قیام پر مرکوز رہیں گی جس کی سرحدیں دریائے اردن سے بحرۂ روم تک وسیع ہیں''، یعنی وہ فلسطین جو اسرائیل کی جگہ لے گا۔ ''اس وقت ہمیں جو کچھ مل رہا ہے اسے حاصل کر کے ہم اس عظیم تر سچائی کو فراموش نہیں کر سکتے''۔ جب تک ''یہ عظیم تر سچائی'' دفن نہیں ہو جاتی اسرائیل کی خیر سگالی، جزوی معاوضہ یا ترک وطن کی علامتی ذمہ داری کسی کام نہ آئے گی بلکہ [فلسطینیوں میں] ''ھل من مزید'' کی خواہش کو مہمیز کرے گی۔

[افرائیم کرش لندن یونیورسٹی کے کنگز کالج میں بحیرۂ روم کے مطالعہ کے سربراہ ہیں۔ وہ عرب – اسرائیل تنازع پر مضامین و مقالات کے علاوہ مشرق وسطیٰ اور اسرائیلی تاریخ پر کئی کتب کے مصنف ہیں۔]